کلیاتِ پریم چند

14

پچاس افسانے

مرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک 1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی 110066

Kulliyat-e-Premchand-14
Edited by : Madan Gopal
Project Assistant : Dr. Raheel Siddiqui

EUHstax
PK
2098
.57
A114
2000
V.14

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت	:	اپریل، جون 2003 شک 1925
پہلا اڈیشن	:	1100
قیمت	:	157/-
سلسلہ مطبوعات	:	1085
کمپوزنگ	:	پرنس گرافکس، نئی دہلی

ISBN. 81-7587-002-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر.کے.پورم، نئی دہلی 110066
طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، 1397 پہاڑی املی، بازار ٹیامحل، جامع مسجد، دہلی-110006

پیش لفظ

ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن منظرعام پر آئیں۔ قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیات پریم چند" کے عنوان سے 22 جلدوں میں ایک مکمل سِٹ کی صورت میں شائع کررہی ہے۔ ان جلدوں میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جارہے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ناول : جلد 1 سے جلد 8 تک، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک،
ڈرامے : جلد 15 و جلد 16، خطوط : جلد 17،
متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک، تراجم : جلد 21 و جلد 22

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسبِ ضرورت پریم چند کے ماہرین سے بھی ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔

کلیات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سن اشاعت اور اشاعتی ادارے کا نام شائع کرنے کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔

"کلیات پریم چند" کی یہ جلدیں قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کا نقش اوّل ہیں۔ اس پروجکٹ کے تحت اردو ادب کے ان ادبا و شعرا کی کلیات شائع کی جائیں گی جو کلاسیکی حیثیت اختیار کرچکی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے کی اس پہلی کاوش میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ضرور راہ پاگئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں قارئین کے مفید مشوروں کا خیر مقدم ہے۔

میں رسوئی میں بیٹھ کر بتاتا جاؤں گا، کام شریمتی جی کو کرنا پڑے گا۔

لیکن ان کے سر میں درد ہوا تب؟

اس کی میرے پاس دوا ہے۔ سر میں چکر آجائے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاجائے، میں بات کی بات میں اچھا کر سکتا ہوں۔

اور جو انھیں گرمی لگے؟

آپ کھڑے پنکھا جھلتے رہیے گا۔

اور انھوں نے کرودھ میں آکر آپ کو کچھ کہہ دیا؟

تو مجھے بھی کرودھ آجائے گا اور کرودھ میں میں لاٹ صاحب کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بعد انھیں پھر کبھی کرودھ نہ آئے گا۔

اور جو انھوں نے بحث شروع کر دی؟ ان کی دلیلوں کا آپ جواب دے سکتے ہیں؟

واہ! اور میں نے عمر بھر کیا کیا ہے۔ پہلے تو دلیل کا جواب دلیل سے دیتا ہوں۔ جب اس سے کام نہیں چلتا تو ہاتھ پاؤں سے بھی کام لے لیتا ہوں۔ کتنے ہی شاستر ارتھوں میں سمّلت ہوا ہوں اور کبھی پراست ہو کر نہیں آیا۔ بڑے بڑے مہامہو پادھیاؤں کو گڑ ہلدی پلا کر چھوڑ دیا۔

سجّن نے ایک چھن تک وچار کیا اور پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے تب سے اب تک صورت نہیں دکھائی۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں 'جاگرن' جولائی 1934 میں شائع ہوا۔ کفن میں شامل ہے اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

دُودھ کی قیمت

اب بڑے بڑے شہروں میں دائیاں اور نرسیں سبھی نظر آتی ہیں۔ لیکن دیہاتوں میں ابھی تک زچہ خانہ روشِ قدیم کی طرح بھنگیوں کے ہی دائرہ اقتدار میں ہے۔ اور ایک عرصہ دراز تک اس میں اصلاح کی کوئی امید نہیں۔ بابو مہیش ناتھ اپنے گاؤں کے زمیندار ضرور تھے، تعلیم یافتہ بھی تھے، زچہ خانہ کی اصلاح کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ لیکن عملی مشکلات کو کیا کرتے۔ دیہات میں جانے کو کوئی نرس راضی بھی ہوئی تو ایسا معاوضہ طلب کیا کہ بابو صاحب کو سر جھکا کر چلے آنے کے سوا کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے کی انھیں ہمّت ہی کیونکر ہو سکتی۔ ان کا حق الخدمت تو غالباً بابو صاحب کی نصف ملکیت بیچ ہونے پر بھی نہ پورا ہوتا۔ آخر جب تین لڑکیوں کے بعد یہ چوتھا لڑکا پیدا ہوا تو پھر وہی گوڈر تھا اور وہی گوڈر کی بہو۔ بچے بیشتر رات ہی کو پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ آدھی رات کو بابو صاحب کے چپراسی نے گوڈرا! کوڈر کی ہانک لگائی کہ چماروں کی ٹولی جاگ اٹھی۔

گوڈر کے گھر میں اس روز سعید کی مہینوں سے تیاری تھی۔ خدشہ تھا تو یہی کہ کہیں بیٹی نہ ہو جائے۔ نہیں تو پھر وہی بندھا ہوا ایک روپیہ اور وہی ایک ساڑی مل کر رہ جائے گی۔ اس مسئلہ پر میاں بیوی میں بار ہا تبادلۂ خیالات ہو چکا تھا۔ شرطیں لگ چکی تھیں۔ گوڈر کی بہو کہتی تھی کہ اگر اب کے بیٹا نہ ہو تو منہ نہ دکھاؤں۔ ہاں ہاں۔ منہ نہ دکھاؤں اور گوڈر کہتا تھا کہ دیکھو بیٹی ہو گی۔ اور بیچ کھیت بیٹی ہوگی۔ بیٹا پیدا ہوا تو مونچھیں منڈوا لوں گا۔ شاید گوڈر سمجھتا تھا کہ اسی طرح بھنگی میں مخالفانہ جوش پیدا کر کے وہ بیٹے کی آمد کے لیے راستہ تیار کر رہا ہے۔

بھنگی بولی۔ ''اب منڈالے مونچھیں ڈاڑھی جا۔ کہتی تھی بیٹا ہوگا، پر سُنے ہی نہیں۔ اپنی رَٹ لگائے۔ کھد تیری مونچھیں مونڈوں گی۔ کھونٹی تو رکھوں نہیں''۔

گوڈر نے کہا۔ ''اچھا مونڈ لینا بھلی مائس، مونچھیں کیا پھر نکلیں ہی نہیں۔ تیسرے دن پھر دیکھے گی جوں کی توں ہیں۔ مگر جو کچھ ملے گا اس میں آدھا رکھ لوں گا۔ کہے دیتا ہوں''۔

بھنگی نے انگوٹھا دکھایا اور اپنے تین مہینے کے بچے کو گوڈر کے سپرد کر، سپاہی کے ساتھ چل دی۔

گوڈر نے پکارا۔ ''سُن تو۔ کہاں بھاگی جاتی ہے؟ مجھے بھی تو روشن چوکی بجانے جانا پڑے گا''۔

بھنگی نے دور ہی سے کہا۔ ''تو کون بڑی مشکل ہے۔ وہیں دھرتی پر لٹا دینا اور روشن چوکی بجانا۔ میں آکر دودھ پلا دیا کروں گی''۔

(2)

مہیش ناتھ کے ہاں اب کے بھنگی کی خوب خاطر کی گئی۔ صبح کو حریرہ ملتا۔ دوپہر کو پوریاں اور حلوا۔ تیسرے پہر کو پھر اور رات کو پھر۔ اور گوڈر کو بھی بھر پور پروسا ملتا تھا۔ بھنگی اپنے بچے کو دن بھر میں دوبار سے زیادہ دودھ نہ پلا سکتی۔ اس کے لیے اوپر کا دودھ مہیا کر دیا جاتا۔ بھنگی کا دودھ بابو صاحب کا بچہ پیتا تھا، اور یہ سلسلہ بارہویں دن بھی نہ بند ہوا۔ مالکن موٹی تازی عورت تھیں، مگر اب کی کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ لڑکیوں کو بدہضمی ہو جاتی تھی۔ اب کی ایک بوند نہیں۔ بھنگی جنائی بھی تھی اور دودھ پلائی بھی۔

مالکن نے کہا۔ ''بھنگی ہمارے بچے کو پال دے۔ پھر جب تک جئے بیٹھی کھاتی رہنا پانچ بیگھے معافی دلوادوں گی۔ تیرے پوتے تک کھائیں گے''۔

اور بھنگی کا لاڈلا اوپر کا دودھ نہ ہضم کر سکنے کے باعث بار بار قے کرتا اور روز بروز لاغر ہوتا جاتا تھا۔ بھنگی کہتی۔ ''اور مونڈن میں چوڑے لوں گی بہو جی! کہے دیتی ہوں''۔

بہو جی۔ ''ہاں ہاں چوڑے لینا بھائی۔ دھمکاتی کیوں ہے؟ چاندی کے لے گی، یا سونے کے''؟

''واہ بہو جی واہ۔ چاندی کے چوڑے پہن کے کسے منہ دکھاؤں گی؟''

''اچھا سونے کے لینا بھئی! کہتی تو ہوں''۔

''اور بیاہ میں کنٹھالوں گی۔ اور چودھری (گوڈر) کے لیے ہاتھوں کے توڑے''۔

بہو جی۔ ''وہ بھی لینا۔ وہ دن تو بھگوان دکھائیں۔''

گھر میں مالکن کے بعد بھنگی کی حکومت تھی۔ مہریاں، مہراجن، مزدورنیں، سب اس کا رُعب مانتی تھیں، یہاں تک کہ خود بہو جی اس سے دب جاتی تھیں ایک بار تو اس نے مہیش ناتھ کو بھی ڈانٹا تھا۔ ہنس کر ٹال گئے۔ بات چلی تھی بھنگیوں کی۔ مہیش ناتھ نے کہا تھا۔ ''دُنیا میں اور چاہے جو کچھ ہو جائے بھنگی بھنگی رہیں گے۔ انھیں آدمی بنانا مشکل ہے''۔

اس پر بھنگی نے کہا تھا۔ ''مالک! بھنگی تو بڑے بڑوں کو آدمی بناتے ہیں۔ انھیں کیا کوئی آدمی بنائے گا؟''

یہ گستاخی کر کے کسی دوسرے موقعہ پر بھلا بھنگی سلامت رہتی۔ سر کے بال اُکھاڑ لیے جاتے لیکن آج بابو صاحب ہنسے۔ قہقہہ مار کر بولے:

''بھنگی بات بڑے پتے کی کہتی ہے''۔

(3)

بھنگی کی حکومت سال بھر تک قائم رہی۔ پھر چھن گئی۔ بچے کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ اب برہمنوں نے بھنگی کا دودھ پینے پر اعتراض کیا۔ موٹے رام شاستری تو پرائشچت کی تجویز کر بیٹھے۔ لیکن مہیش ناتھ احمق نہ تھے۔ پھٹکار بتائی۔ پرائشچت کی خوب کہی آپ نے شاستری جی۔ کل تک اسی بھنگن کا خون پی کر پلا۔ اب پرائشچت کرنا چاہیے۔ واہ!''

شاستری جی بولے۔ ''بے شک کل تک بھنگن کا خون پی کر پلا۔ گوشت کھا کر پلا۔ یہ بھی کہہ سکتے ہو لیکن کل کی بات کل تھی آج کی بات آج ہے۔ جگن ناتھ پور میں تو چھوت اچھوت سب ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ مگر یہاں تو نہیں کھا سکتے۔ کھچڑی تک کھا لیتے ہیں بابو جی اور کیا کہیں؟ پوری تک نہیں رہ جاتے۔ لیکن اچھے ہو جانے پر تو نہیں کھا سکتے''۔

''تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دھرم بدلتا رہتا ہے۔ کبھی کچھ کبھی کچھ''۔

''اور کیا! راجہ کا دھرم الگ پرجا کا دھرم الگ، امیر کا دھرم الگ غریب کا دھرم

الگ، راجے مہاراجے جو چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں شادی بیاہ کریں۔ ان کے لیے کوئی قید نہیں۔ راجہ ہیں۔ مگر ہمارے اور تمھارے لیے تو قدم قدم پر بندشیں ہیں۔ اس کا دھرم ہے''۔ پرائشچت تو نہ ہوا۔ لیکن بھنگی سے اس کی سلطنت چھینی گئی۔ برتن، کپڑے، اناج اتنی کثرت سے ملے کہ وہ اکیلی نہ لے جاسکی۔ اور سونے کے چوڑے بھی ملے اور ایک دو نئی اور خوبصورت ساڑھیاں، معمولی نین سکھ کی نہیں جیسی لڑکیوں کی بار ملی تھیں۔

(4)

اسی سال چیچک کا زور ہوا۔ گوڈر پہلے ہی زد میں آگیا۔ بھنگی اکیلی رہ گئی۔ مگر کام جوں کا توں چلتا رہا۔ بھنگی کے لیے گوڈر اتنا ضروری نہ تھا جتنا گوڈر کے لیے بھنگی۔ لوگ منتظر تھے کہ بھنگی اب گئی اب گئی۔ فلاں بھنگی سے بات چیت ہوئی۔ فلاں چودھری آئے۔ لیکن بھنگی کہیں نہ گئی۔ یہاں تک کہ پانچ سال گزر گئے۔ اور منگل دُبلا، کمزور اور دائم المریض رہنے پر بھی دوڑنے لگا۔ ماں کا دودھ نصیب ہی نہ ہوا۔ دائم المریض کیوں نہ ہوتا؟

ایک دن بھنگی مہیش ناتھ کے مکان کا پرنالہ صاف کر رہی تھی۔ مہینوں سے غلاظت جمع ہوگئی تھی۔ آنگن میں پانی بھرا رہنے لگا تھا۔ پرنالے میں ایک لمبا موٹا بانس ڈال کر زور سے ہلا رہی تھی۔ پورا داہنا ہاتھ پرنالے کے اندر تھا کہ یکا یک اس نے چلّا کر ہاتھ باہر نکال لیا اور اسی وقت ایک لمبا سا کالا سانپ پرنالے سے نکل کر بھاگا۔ لوگوں نے دوڑ کر اسے تو مار ڈالا لیکن بھنگی کو نہ بچا سکے۔ خیال تھا کہ پانی کا سانپ ہے، زیادہ زہریلا نہ ہوگا۔ اس لیے پہلے کچھ غفلت کی گئی۔ جب زہر جسم میں پیوست ہوا اور لہریں آنے لگیں تب پتہ چلا کہ پانی کا سانپ نہیں کالا سانپ تھا۔

منگل اب یتیم تھا۔ دن بھر مہیش بابو کے دروازے پر منڈ لایا کرتا۔ گھر میں اتنا جھوٹا بچتا تھا کہ ایسے ایسے دس پانچ بچے سیر ہو سکتے تھے۔ منگل کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ ہاں دور ہی سے اسے مٹی کے ایک سکورے میں کھانا ڈال دیا جاتا اور گاؤں کے لڑکے اس سے دور دور رہتے تھے۔ یہ بات اسے اچھی نہ لگتی تھی۔ سب لوگ اچھے اچھے برتنوں میں

کھاتے ہیں۔ اس کے لیے مٹی کے سکورے! یوں اسے اس تفریق کا مطلق احساس نہ ہوتا۔ لیکن لڑکے اسے چڑھا چڑھا کر اس ذلت کے احساس کو سان پر چڑھاتے رہتے تھے۔ مکان کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ اسی کے نیچے منگل کا ڈیرا تھا۔ ایک پھٹا پھٹا سا ٹاٹ کا ٹکڑا، دو سکورے اور ایک دھوتی جو مہیش بابو کے خوش نصیب فرزند سریش کے اتارے کپڑوں میں سے ایک تھی۔ جاڑا، گرمی، برسات، ہر موسم کے لیے وہ ایک سی آرام دِہ تھی۔ یہی اس کی خصوصیت تھی۔ اور سخت جان منگل جھلستی ہوئی لو اور کڑا کے کے جاڑوں اور موسلا دھار بارش میں بھی زندہ تھا۔ اور تندرست تھا۔ بس اس کا کوئی رفیق تھا تو گاؤں کا ایک کتّا جو اپنے ہم چشموں کی بد مزاجیوں اور تنگ ظرفیوں سے عاجز آ کر منگل کے زیر سایہ آپڑا تھا۔ کھانا دونوں کا ایک تھا۔ کچھ طبیعت بھی یکساں تھی اور غلبًا دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہو گئے تھے۔

منگل نے اس کا نام رکھا تھا ٹامی۔ مگر ٹامی مہیش ناتھ کے انگیزی کتّے کا نام تھا۔ اس لیے اس نام کا استعمال وہ اسی وقت کرتا جب دونوں رات کو سونے لگتے۔

منگل کہتا۔ ''دیکھو ٹامی، ذرا اور کھسک کر سوؤ۔ آخر میں کہاں لیٹوں۔ سارا ٹاٹ تو تم نے گھیر لیا''۔ ٹامی کُوں کُوں کرتا اور دُم ہلاتا، بجائے اس کے کہ کھسک جائے اور اوپر چڑھ آتا اور منگل کا منہ چاٹنے لگتا۔ شام کو وہ ایک بار روز اپنا گھر دیکھنے اور تھوڑی دیر رونے جاتا۔ پہلے سال پھوس کا چھپّر گرا۔ دوسرے سال ایک دیوار گری اور اب صرف آدھی آدھی دیواریں کھڑی تھیں۔ جن کا اوپر کا حصّہ نوکدار ہو گیا تھا۔ یہیں اسے محبت کی دولت ملی تھی۔ وہی مزا، وہی یاد، وہی کشش اسے ایک بار ہر روز اس ویرانے میں کھینچ لے جاتی۔ اور ٹامی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ کھنڈر کی مخروطی دیوار پر بیٹھ جاتا اور زندگی کے آنے والے اور گذشتہ خواب دیکھنے لگتا۔ اور ٹامی دیوار پر کود جانے کی بار بار ناکام کوشش کرتا۔

(5)

ایک دن کئی لڑکے کھیل رہے تھے۔ منگل بھی پہنچ کر دور کھڑا ہو گیا۔ سریش کو اس پر رحم آیا یا کھیلنے والوں کی جوڑی پوری نہ پڑتی تھی۔ کچھ ہی ہو، اس نے تجویز کی، کہ

آج منگل کو بھی کھیل میں شریک کر لیا جائے۔ یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔

سریش نے منگل سے پوچھا۔ ''کیوں رے کھیلے گا؟''

منگل بولا۔ ''کھلاؤ گے تو کیوں نہ کھیلوں گا۔''

سریش نے کہا۔ ''اچھا تو ہم تینوں سوار بنتے ہیں۔ تم تو بن جاؤ۔ پھر ہم لوگ تمھارے اوپر سوار ہو کر گھوڑا دوڑائیں گے''۔

منگل نے پوچھا۔ ''میں برابر گھوڑا ہی رہوں گا کہ سواری بھی کروں گا۔''

یہ مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ سریش نے ایک لمحہ غور کرکے کہا۔ ''تجھے کون اپنی پیٹھ پر بٹھائے گا۔ سوچ آخر تو بھنگی ہے کہ نہیں؟''

منگل نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا۔ ''میں کب کہتا ہوں کہ میں بھنگی نہیں ہوں۔ لیکن جب تک مجھے بھی سواری کرنے کو نہ ملے گی گھوڑا نہ بنوں گا۔ تم لوگ سوار بنو گے اور میں گھوڑا ہی بنا رہوں گا؟''

سریش نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ ''تجھے گھوڑا بننا پڑے گا''۔ اس نے منگل کو پکڑنا چاہا۔ منگل بھاگا۔ سُریش بھی دوڑا۔ منگل نے قدم اور تیز کیا۔ سریش نے بھی زور لگایا مگر بسیار خوری نے اسے تھل تھل بنا دیا تھا۔ اور دوڑنے سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ آخر سریش نے رُک کر کہا۔ ''آکر گھوڑا بنو منگل۔ ورنہ کبھی پاؤں گا تو بری طرح پیٹوں گا''۔

''تمھیں بھی گھوڑا بننا پڑے گا''۔

''اچھا ہم بھی بن جائیں گے''۔

''تم بعد میں بھاگ جاؤ گے۔ اس لیے پہلے تم بن جاؤ۔ میں سواری کرلوں۔ پھر میں بنوں گا''۔

سریش نے چکمہ دیا۔ منگل کے اس مطالبہ نے برہم کردیا۔ ساتھیوں سے بولا۔ ''دیکھو اس کی بدمعاشی! بھنگی ہے''۔ تینوں نے اب کی منگل کو گھیر لیا اور زبردستی گھوڑا بنا دیا۔ سریش اپنا وزنی جسم لے کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ اور ٹک ٹک کرکے بولا۔ ''چل گھوڑے چل''۔ مگر اس بوجھ کے نیچے غریب منگل کے لیے ہلنا بھی مشکل تھا۔ دوڑنا تو دور کی بات تھی۔ ایک لمحہ تو وہ ضبط کیے چوپایہ بنا کھڑا رہا۔ لیکن ایسا معلوم ہونے لگا کہ

ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی جاتی ہے۔ اس نے آہستہ سے پیٹھ سکوڑی اور سریش کی ران کے نیچے سے سرک گیا۔ سریش گد سے گر پڑے، اور بھونپو بجانے لگے۔ ماں نے سُنا سریش کیوں رو رہا ہے؟ گاؤں میں کہیں سریش روئے اُن کے ذکی الحس کانوں میں ضرور آواز آجاتی تھی، اور اس کا رونا تھا بھی دوسرے لڑکوں سے بالکل نرالا جیسے چھوٹی لائن کے انجن کی آواز۔

ایک منٹ میں سریش آنکھیں ملتا ہوا گھر میں آیا۔ آپ کو جب کبھی رونے کا اتفاق ہوتا تھا تو گھر میں فریاد لے کر ضرور آتے تھے۔ ماں چپ کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ دے دیتی تھی۔ آپ تھے تو آٹھ سال کے، مگر بہت بیوقوف، حد سے زیادہ پیارے۔ ماں نے پوچھا۔ ''کیوں رو رہا ہے سریش؟ کس نے مارا''؟ سریش نے روتے ہوئے کہا۔ منگل نے چھوا دیا''۔

پہلے تو ماں کو یقین نہ آیا۔ لیکن جب سریش قسمیں کھانے لگا تو یقین لانا لازم ہوگیا۔ اُس نے منگل کو بُلوایا۔ اور ڈانٹ کر بولی۔ ''کیوں رے منگلوا۔ اب تجھے بدمعاشی سوجھنے لگی۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ سریش کو چھونا نہیں۔ یاد ہے کہ نہیں؟ بول''۔ منگل نے دبی آواز سے کہا ''یاد ہے''۔

''تو پھر تو نے اسے کیوں چھوا؟... تو نے نہیں چھوا تو یہ روتا کیوں تھا''؟

''یہ گر پڑے اس لیے رونے لگے''۔

''چوری اور سینہ زوری''۔ دیوی دانت پیس کر رہ گئیں۔ مارتیں تو اسی وقت اشنان کرنا پڑتا۔ قمچی تو ہاتھ میں لینا ہی پڑتی اور چھوت کی برقی رو قمچی کے راستہ ان کے جسم میں سرایت کر جاتی۔ اس لیے جہاں تک گالیاں دے سکیں دیں اور حکم دیا کہ ''اسی وقت یہاں سے نکل جا۔ پھر جو تیری صورت نظر آئی تو خون ہی پی جاؤں گی۔ مفت کی روٹیاں کھا کھا کر شرارت سوجھتی ہے۔

منگل میں غیرت تو کیا ہوگی خوف تھا۔ چپکے سے اپنے سکورے اٹھائے، ٹاٹ کا ٹکڑا بغل میں دبایا، دھوتی کندھے پر رکھی اور روتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ یہی تو ہوگا کہ بھوکوں مرجائے گا۔ کیا ہرج ہے، اس طرح جینے سے فائدہ ہی کیا؟ گاؤں میں اور کہاں جاتا۔ بھنگی کو کون پناہ دیتا۔ وہی اپنے بے در و دیوار

کی آڑ تھی، جہاں پچھلے دنوں کی یادیں اس کے آنسو پونچھ سکتی تھیں۔ وہیں جاکر پڑ رہا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ٹامی بھی اسے ڈھونڈتا ہوا آپہنچا۔

(6)

لیکن جوں جوں شام ہوتی گئی، اس کا احساس ذلت بھی غائب ہوتا گیا۔ بچپن کی بیتاب کرنے والی بھوک جسم کا خون پی پی کر اور بھی بے پناہ ہوتی جاتی تھی۔ آنکھیں بار بار سکوروں کی طرف اُٹھ جاتیں۔ اس نے مشورتاً ٹامی سے کہا۔ ''کھاؤ گے کیا؟ میں تو بھوکا ہی لیٹ رہوں گا۔ ٹامی نے کوں کوں کرکے شاید کہا۔ ''اس طرح کی ذلتیں تو ساری زندگی سہنی ہیں۔'' پھر ذرا دیر کے بعد دُم ہلاتا ہوا اس کے پاس جاپہنچا۔ ہماری زندگی اسی لیے ہے بھائی۔

منگل بولا۔ ''تم جاؤ جو کچھ مل جائے کھالو۔ میری پرواہ نہ کرو''۔ ٹامی نے پھر اپنی سگستانی بولی میں کہا۔ ''اکیلا نہیں جاتا۔ تمھیں ساتھ لے کر چلوں گا''۔ ایک لمحہ بعد بھوک نے تالیف کا ایک نیا پہلو اختیار کیا۔ ''مالکن تلاش کر رہی ہوں گی۔ کیوں ٹامی''۔ اور ''کیا بابوجی اور سریش کھا چکے ہوں گے؟ کہار نے ان کی تھالی کا جھوٹا نکال لیا ہوگا اور ہمیں پکار رہا ہوگا''— ''بابوجی اور سریش دونوں کی تھالیوں میں گھی اور وہ میٹھی میٹھی چیز۔ ہاں ملائی۔ ہماری آواز نہ سُنائی دے گی تو سب کا سب گھوڑا پر ڈال دیں گے۔ ذرا دیکھ لیں کہ ہمیں کوئی پوچھنے آتا ہے''۔ ''یہاں کون پوچھنے آئے گا۔ کوئی برہمن ہو''۔

''اچھا تو چلو وہیں چلیں مگر چھپے ہوئے رہیں گے۔ اگر کسی نے نہ پکارا تو میں لوٹ آؤں گا، یہ سمجھ لو''۔

دونوں وہاں سے نکلے اور آکر مہش ناتھ کے دروازے پر ایک کونے میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔ ٹامی شاید اِدھر اُدھر کی خبر لانے چلا گیا۔ مہیش بابو تھالی پر بیٹھ گئے تھے۔ نوکر آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: ''آج منگلوا نہیں دکھائی دیتا۔ بھوکا ہوگا بیچارا۔ مالکن نے ڈانٹا تھا، اسی لیے بھاگا ہے شاید''۔ منگل کے جی میں آیا چل کر اس آدمی کے قدموں پر گر پڑے۔ دوسرے نے جواب دیا۔ ''اچھا ہوا نکالا گیا نہیں تو

سویرے سویرے بھنگی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا''۔ منگل اور اندھیرے میں کھسک گیا۔ اب کیا امید کی جاسکتی تھی۔ مہیش اور سریش تھالی سے اُٹھ گئے۔ نوکر ہاتھ منہ دھلا رہا ہے۔ اب بابوجی حقہ پئیں گے۔ سریش سوئے گا۔ غریب منگل کی کسے فکر ہے۔ اتنی دیر ہوگئی کسی نے نہیں پکارا۔ کون پکارے گا۔ منگل آدھ گھنٹے تک وہاں دبکا رہا۔ کسی نے اس کا نام نہ لیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور جانا ہی چاہتا تھا کہ اس نے اسی کہار کو ایک تھال میں جوٹھا کھانا لے جاتے دیکھا۔ شاید گھورے پر ڈالنے جا رہا تھا۔ منگل اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آگیا۔ اب صبر نہ ہوسکتا تھا۔ کہار نے کہا۔ ''ارے تو یہاں تھا۔ ہم نے کہا کہیں چلا گیا لے کھا لے۔ میں پھینکنے لے جارہا تھا''۔ منگل نے کہا۔ ''میں تو بڑی دیر سے یہاں کھڑا تھا''۔ کہار نے کہا ''تو بولا کیوں نہیں''؟ منگل بولا۔ ''ڈر لگتا تھا''۔ منگل نے کہار کے ہاتھ سے تھال لے لیا اور اسے ایسی نظر سے دیکھا جس میں شکر اور احسان مندی کی ایک دنیا چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ دونوں نیم کے درخت کے نیچے حسب معمول کھانے لگے۔ منگل نے ایک ہاتھ سے ٹامی کا سر سہلا کر کہا۔ ''دیکھا پیٹ کی آگ ایسی ہوتی ہے۔ لات کی ماری ہوئی روٹیاں بھی نہ ملتیں تو کیا کرتے''۔ ٹامی نے دُم ہلائی۔ ''سریش کو اماں ہی نے پالا ہے ٹامی''۔ ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔ ''لوگ کہتے ہیں دودھ کا دام کوئی نہیں چکا سکتا''۔ ٹامی نے پھر دُم ہلادی۔ ''اور مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے'' ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے جولائی 1934 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'مان سرووَر نمبر 2' میں شامل ہے۔ اردو میں اسی نام کے مجموعہ میں شامل ہے۔)